سلسلہ اشاعت امامیہ مشن ۱۳۵

نبوت

از افادات

سرکار سید العلماء مدظلہ

قیمت ۲ر — محصول ۱ر

تعارف

امامیہ مشن نے "اصول دین" پر جو مختصر رسائل کا سلسلہ اپنے ذمہ لیا ہے اُس کے دو رسالے "توحید" اور "عدل" اس کے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

یہ رسالہ اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے جو "نبوت" کے موضوع پر شائع ہو رہا ہے اور اُسی خصوصیت کا حامل ہے جو اس کے پہلے رسالوں میں موجود ہے یعنی اختصار کے ساتھ جامعیت۔

امید ہے کہ افراد قوم اس رسالہ کو بھی کثیر تعداد میں خرید فرما کر خود پڑھیں، اپنے بچوں کو پڑھائیں اور غیر اقوام میں تقسیم فرمائیں گے والسلام

خادم ملت
۲۴ر جون ۱۹۵۴ء سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین

نبوت یعنی یہ کہ اللہ کی طرف سے خلق خدا کو ٹھیک راستہ بتانے کے لیے ایسے انسان مقرر کیے جاتے رہے ہیں جنھیں نبی کہا جاتا ہے۔

ربوبیت اور عدالت کا مجموعی تقاضا

"نبوت" کا درجہ توحید اور "عدل" کے بعد ہے اور وہ انھی حقیقتوں پر مبنی ہے جن کی تصدیق توحید اور عدل میں حد ثبوت تک پہونچ چکی ہے۔

اگر کائنات کا آغاز بے شعور ذرات مادہ سے ہوا ہوتا، اگر اُن کا خالق شعور و احساس سے عاری ہوتا، اگر وہ ارادہ و اختیار کے ماتحت کاموں کے انجام دینے سے قاصر ہوتا یا وہ کائنات کو وجود میں لا کر اُس سے بے تعلق ہو گیا ہوتا اس طرح کہ اُس کے اچھے بُرے سے کوئی سروکار نہ رکھتا ۔۔ اور پھر اگر انسان اپنے افعال میں مجبور ہوتا اور خالق خود اپنے قہری ارادہ سے اضطراری طور پر جو چاہتا اُس سے

کرا لیا کرتا تو ان سب صورتوں میں نبوت کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا مگر یہ توحید کی منزل میں طے ہو چکا کہ اس کائنات کا ایک ایسا خالق ہے جو علم و حکمت اور ارادہ و قدرت کا مالک ہے اور وہ کائنات کو پیدا کر کے اُس سے بے تعلق نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ رب ہے رب؟ یعنی تربیت کرنے والا۔ تربیت؟ کسی شے کو رفتہ رفتہ اُس کے مناسب حد کمال تک پہنچانا۔

انسان کے علاوہ ہر شے اپنی منزل تک تخلیقی نظام کے ماتحت اللہ کے ارادہ سے پہنچتی ہے۔ اس کے لیے درمیان میں کسی سفیر اور پیغام رساں یا رہبر کی ضرورت نہیں ہے۔

انسان بھی اپنی زندگی کی فطری رفتار میں پیدائش، بچپنے، جوانی پیری اور موت کے مرحلوں کو اسی نظام کے ماتحت طے کرتا ہے۔ اب اس کے نظریات و افکار اور اعمال جو اس کی انسانیت کا خاصۂ امتیازی ہیں۔ یہ بھی اگر جبری طور پر ارادۂ الٰہی کے ماتحت انجام پاتے تو نبی کی ضرورت نہ تھی۔ اللہ جس راستے پر چاہتا، اُس پر اپنی قدرت سے خود ہی چلا دیتا۔

لیکن یہ عدل میں ثابت ہو چکا کہ انسان اپنے افعال و اعمال میں خود مختار بنایا گیا ہے۔ اس کا کام ہے کہ یہ اپنے ارادہ و اختیار سے ٹھیک راستے پر چلے اور غلط راستے سے بچے۔ لہذا اللہ کی ربوبیت جو اس کو مناسب حد کمال تک پہنچنے کا سامان کرنے کی ذمہ دار ہے

تقاضی ہے کہ وہ ایسا سامان کرے کہ انسان کے سامنے ٹھیک اور غلط راستے پیش ہو جائیں اس طرح کہ اس پر کوئی جبر عائد نہ ہو بلکہ یہ اپنے ارادہ سے خود ٹھیک راستے پر چلے تو اطاعت شعار قرار پائے اور غلط راستے پر چلے تو نافرمان قرار پائے۔

اس طرح اس کی انسانیت کا جوہر اپنے اخلاق و اعمال سے ترقی اور کمال کی منزل تک باختیار خود پہنچے جو اس کی انسانی بلندی کا تقاضا ہے۔

یہی دستورِ حیات جو انسان کو کمال کے نقطہ تک پہنچانے کے لیے خالق کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے "شریعت" کہلاتا ہے اور وہ برگزیدہ انسان جو اس شریعت پر عمل کرانے اور انسانوں کو صحیح راستہ بتانے کے لیے مقرر ہوتا ہے نبی کہلاتا ہے۔ ہدایت و اصلاح کے کام پر اُس کے مامور کیے جانے کو بعثت کہتے ہیں اور اللہ اپنے احکام جس طریقہ سے اُس نبی تک پہنچائے اُس طریقہ کو وحی کہتے ہیں۔

عصمت

اللہ کی جانب سے خلق خدا کی ہدایت کے لیے جو ہستی مقرر کی جائے وہ ایسی ہی ہو سکتی ہے جس کی ذات سے بھولے چوکے کسی طرح بھی گمراہی خلق کا اندیشہ نہ ہو۔ جو اللہ کے علم میں ایسا کامل انسان ہو اسی کو معصوم کہتے ہیں۔

افضلیت

نبی چونکہ افرادِ انسانی کو کمال کی منزل تک پہنچانے کے لیے آتا ہے اس لیے اُسے اپنے ماتحت دائرہ کے تمام افراد سے تمام انسانی کمالات میں بڑھ کر ہونا چاہیے تاکہ دوسرے لوگوں کو اُس کی پیروی کا حکم دیا جانا ناانصافی قرار نہ پائے۔

ہر قوم میں رہنما

خالق کی ربوبیت محدود نہیں ہے اس لیے اُس کی رہنمائی سے کسی ملک اور قوم کو محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ یقیناً اُس نے ہر مُلک اور قوم کے لیے کسی نہ کسی کو رہنما ضرور قرار دیا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اقوام اور بعض ممالک کے متعلق ہمیں صحیح علم نہ ہو کہ اُن کی سچی رہنمائی اللہ کی طرف سے کن اشخاص کے متعلق تھی یا اُس قوم نے اُس کی تعلیم سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو یا اب وہ اُس سے دور جا پڑی اور جو تعلیم اُس کی طرف اب منسوب کی جاتی ہے وہ اُس کی اصلی تعلیم نہ ہو بلکہ مسخ ہو کر رہ گئی ہو۔

انبیائے گزشتہ

سابق زمانہ کے پیغمبروں کے جو نام ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

آدم۔ ادریس۔ نوح۔ ابراہیم۔ لوط۔ اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ یعقوب۔ یوسف۔ خضر۔ موسیٰ۔ ہرون۔ شعیب۔ ایوب۔ ہود۔ صالح۔ یونس۔ داؤد۔ سلیمان۔ ذوالکفل۔ الیسع۔ زکریا۔ یحییٰ۔ عیسیٰ۔

ان کی نبوت پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

ان کے علاوہ باقی انبیاء کا نام بنام یقین نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں مجمل طور پر یہ ماننا ضروری ہے کہ جتنے رہبر اللہ کی طرف سے آئے سب سچے تھے

اولوالعزم

جو انبیاء عملی دستورِ حیات یعنی شریعت لے کر آئے انھیں انبیاء اولوالعزم کہتے ہیں۔ وہ گزشتہ انبیاء میں صرف چار تھے نوح، ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ ان کے پہلے زندگی کے ابتدائی قاعدے جناب آدم کے وقت سے اُن کی اولاد میں ضرور نافذ تھے مگر وہ زندگی کے تمام گوشوں کو شاید اس حد تک حاوی نہ تھے کہ اُنھیں "شریعت" کے نام سے موسوم کیا جاتا اور اسی لیے جناب آدم اولوالعزم کی فہرست میں داخل نہیں ہوئے۔

کتب

ان انبیاء میں تین کو کتابیں عطا ہوئیں!

موسیٰ کو توریت۔ داؤد کو زبور اور عیسیٰ کو انجیل۔

باقی بعض انبیاء کو بھی "صحیفے" عطا ہوئے مگر وہ اُس معیار پر نہ تھے جنھیں کتاب کے نام سے موسوم کیا جاتا۔

ممکن ہے توریت کے ساتھ بائبل میں جو بہت سے صحیفے درج ہیں ان میں سے بعض یا سب اصلیت کے لحاظ سے ٹھیک ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ توریت، زبور انجیل اور ان تمام صحف کے موجودہ نسخے جو بائبل کے نام سے دنیا میں رائج ہیں وہ اصل کتب و صحف نہیں جو اللہ کی طرف سے اُس کے پیغمبروں پر نازل ہوئے تھے بلکہ یہ بعد کے ساختہ پرداختہ ہیں۔

معجزہ

ہر رسول کے ساتھ اُس کی سچائی کا کوئی نشان ہونا چاہیے جس کو شکست دینے اور اُس کا جواب لانے سے دوسرے عاجز ہوں۔ اس نشان کو "معجزہ" کہتے ہیں۔

یہ ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو عقلاً غیر ممکن ہو لیکن ایسی چیز ضرور ہوتی ہے جو عام انسانی طاقتوں سے بالاتر ہو۔ اسی وجہ سے خصوصی طور پر اللہ کی جانب سے مقرر ہونے کی دلیل قرار پاتی ہے۔

پہلے نبی

سب سے پہلے اللہ کی طرف سے جو نبی مقرر ہوئے وہ حضرت آدم تھے جو نوعِ انسانی کی پہلی فرد اور اس تمام نسل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

آدم مثل تمام انبیاء کے گناہوں سے بری تھے جب ہی خالق کی طرف سے نبوت کے منصب پر فائز ہوئے۔

گیہوں کھانے سے جو اُن کو ممانعت ہوئی وہ کوئی قانونی حکم نہ تھا جس کی مخالفت کو "گناہ" سمجھا جا سکے بلکہ وہ ایک ناصحانہ ہدایت تھی جس کی مخالفت میں وقتی طور پر یہ نقصان تھا کہ اس کے بعد وہ اس باغ میں جس کا نام "جنت" تھا قیام نہیں کر سکتے تھے چنانچہ گیہوں کھانے سے اُنھیں یہ نقصان برداشت کرنا پڑا، حالانکہ اگر یہ نہ بھی ہوتا تب بھی بالآخر وہ بھیجے جاتے اسی زمین پر کیونکہ نسل انسانی کا آگے بڑھنا اُن کے ذریعہ سے اور زمین پر خلافت الٰہی کے منصب کا انتظام جو اُن کا مقصد خلقت تھا، بغیر اس کے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

عیسیٰ ابن مریم

عیسیٰ اللہ کے ایک سچے نبی اور اُن کی ماں مریم ایک پاکباز مقدس خاتون تھیں۔ اُنھیں اللہ نے اپنی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا کیا جس طرح آدم کو ماں باپ دونوں کے بغیر اُس نے پیدا کیا تھا۔ اس کی وجہ سے اُنھیں خدا یا خدا کا بیٹا کہنا غلط ہے کیونکہ پیدا ہونا خود مخلوق ہونے کی نشانی ہے لہٰذا وہ خود خدا نہیں ہو سکتے اور بچہ باپ کا ایک جزء ہوتا ہے اور اللہ واجب الوجود ہے۔ اُس کا کوئی جزو نہیں ہو سکتا لہٰذا اُس کا بیٹا بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔

آخری رسول

سب کے آخر میں اللہ نے ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا۔ آپ اپنے پہلے کے تمام انبیاء سے افضل و بہتر تھے اور آپ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا آپ ہی کی رسالت ہمیشہ کے لیے قائم و برقرار ہے۔

آخری کتاب

اللہ کی طرف سے حضرت محمد مصطفیٰ پر آخری کتاب نازل ہوئی جو "قرآن مجید" ہے

اس میں وہ تمام حقیقتیں جو سابق کتب میں نازل کی گئی تھیں محفوظ ہیں اور اُن کے آگے بھی قیامت تک کی رہنمائی کے لیئے جامع تعلیمات درج ہیں۔

شریعت محمدی

سابق انبیاء کی شریعتیں اکثر ایسے احکام پر بھی مشتمل تھیں جو کسی محدود عبوری دور کے لیے موزوں و مناسب تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ قانون عطا ہوا جو مختتم حیثیت سے نوع انسانی کی انفرادی اور اجتماعی صلاح و فلاح کے ذرائع پر مشتمل ہے اس لیے اس شریعت نے گزشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ قرار دیدیا اور یہ دائمی ہے جس میں تبدیلی کا

کوئی امکان نہیں ہے۔

دلائل نبوت

ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ جن کے والد عبداللہ دادا عبدالمطلب، پردادا ہاشم بن عبدمناف آل ابراہیم میں سے ابراہیم کے فرزند اسمٰعیل کی نسل سے تھے۔ آپ چالیس برس کی عمر میں رسالت کے اظہار پر مامور ہوئے اور آپ کے دعوے کی سچائی کثیر التعداد یقینی دلائل سے ہر صاحب ہوش و خرد کے سامنے نمایاں تھی اور ہے مثلاً

(۱) گزشتہ انبیاء کی پیشین گوئیاں جو باوجود تحریف و تبدیلی کے بائبل میں ابتک نظر آتی ہیں اور حضرت کی بعثت کے وقت اور زیادہ نمایاں طور پر موجود تھیں۔

(۲) حضرت کی مقدس اور پاک سیرت جس کا چالیس برس تک مشاہدہ ہو چکا تھا۔ حضرت کی زندگی میں خصوصیت کے ساتھ سچائی اور امانتداری کا جوہر اتنا نمایاں تھا کہ مشرکین نے آپ کا لقب ہی صادق اور امین قرار دے لیا تھا۔

(۳) وہ غیر معمولی شواہد جنھیں معجزات کہتے ہیں حضرت کے لیے اس طرح کے معجزے بھی ظاہر ہوئے جیسے سابق پیغمبروں سے ظاہر ہوئے تھے یعنی جن کا مشاہدہ سے تعلق تھا جن میں بہت نمایاں شق القمر (چاند کا دو ٹکڑے ہونا) اور رجعت شمس (سورج کا پلٹنا) تھا اور ایک معجزہ آپ کا ہر دور کے اشخاص کے لیے باقی ہے وہ "قرآن مجید" ہے۔

قرآن کس کس حیثیت سے معجزہ ہے اس کا بیان تفصیل سے ہماری کتاب ”مقدمۂ تفسیر قرآن“ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دین اسلام اور شریعت محمدی

اسلام نام ہے اُس دینِ حق کا جس کا اصل اصول توحید یعنی بلا شرکت غیرے خالق کی عبادت ہے۔

یہ دین ازل سے ایک ہی تھا۔ آدم سے لیکر خاتم تک تمام انبیاء اسی کی تبلیغ کے لیے آئے لیکن اُسے زیادہ واضح، دلنشین اور موثر طور پر حضرت محمد مصطفےٰ ص نے پیش کیا۔ اس اعتبار سے آپ کو ”بانی اسلام“ کہا جاتا ہے۔

مگر شریعت اُس قانون کو کہتے ہیں جس کو عملی زندگی میں اصلاح و تکمیل نفوس اور تنظیم خلق کے لیے خالق کی طرف سے نافذ کیا گیا ہو۔ اس کے احکام ماحول اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہو سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ شریعتوں کے بہت سے احکام شریعت محمدی میں منسوخ کر دیے گئے۔ بے شک اس شریعت میں ایسے جامع اصول رکھ دیے گئے ہیں کہ اب یہ منسوخ ہونے والی نہیں ہے

نسخ

اللہ کی طرف سے قانون کے کسی جزو کے تبدیل کر دینے کو ”نسخ“ کہتے ہیں۔

یہ تبدیلی کسی ناواقفیت یا پشیمانی کا نتیجہ نہیں بلکہ حالات اور مصالح کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

شریعت اسلام کی اکملیت

شریعت اسلام کی خاص خصوصیت اُس کے احکام کا معتدل ہونا ہے۔ اُس میں نہ مادی ضرورتوں کو نظر انداز کیا گیا اور نہ روح کے تقاضوں کو بلکہ مادیت کے ساتھ روحانیت کو سمو دیا گیا ہے اور دین کے ساتھ دنیا کے آباد رکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔

رہنمایان اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ لیس منا من ترک الدین للدنیا ولا من ترک الدنیا للدینہ (یعنی) ہم سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کو دنیا کی خاطر چھوڑ دے اور نہ اُس کا جو دنیا کو دین کی خاطر تج دے۔

یہاں کا خاص اصول یہ ہے کہ الدنیا مزرعة الآخرة ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے“ اور یہ کہ لا رهبانية في الاسلام ”اسلام میں علائق دنیا کا ترک کر دینا نہیں ہے“

عبادت کا مفہوم

شریعت اسلام میں عبادت صرف کچھ رسوم کے ادا کرنے یا بلا وجہ اپنے نفس یا جسم کو تکلیف دینے کا نام نہیں ہے بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر کام جو خالق کی رضا کے لیے اُس کے قانون کے

ماتحت انجام دیا جائے عبادت ہے۔

اس میں خالق کی تعظیم و پرستش کے طریقوں کے ساتھ ساتھ جسمانی زندگی کے تقاضے جیسے کھانا، پینا، سونا جاگنا اور منزلی زندگی کے تقاضے جیسے اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ، بیوی بچوں کے ساتھ محبت و شفقت کے مظاہرے اور سیاسی زندگی کے تقاضے جیسے افراد قوم کی بہبودی کے سامان اور اُن کی اصلاح و ترقی میں کوشش وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔

کتاب باقی

قرآن اس معنی میں تو کتاب باقی ہے ہی کہ پہلے کی کتابوں میں جو شرعی احکام تھے وہ اب منسوخ ہو چکے ہیں یا زیادہ مکمل طور پر قرآن میں آ گئے ہیں، اس لیے اُن کتابوں کے کتاب الٰہی ہونے پر ہمیں فقط ایمان لانا ہے مگر عمل کی دنیا میں قرآن ہی ہے جسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قرآن اس اعتبار سے بھی "کتاب باقی" ہے کہ دوسری کسی آسمانی کتاب کا وجود اپنی اصلی شکل میں دنیا کی کسی قوم کے پاس اس وقت نہیں ہے (اس کی تشریح امامیہ مشن کے رسالہ "تحریف قرآن کی حقیقت" میں تفصیل مذکور ہے)

صرف قرآن مجید وہ کتاب ہے جو اپنے اصلی الفاظ کے ساتھ اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ یوں چاہے جتنے ترجمے قرآن کے دنیا کی

زبانوں میں ہو جائیں مگر اُن میں سے کوئی ترجمہ بھی مسلمانوں کے نزدیک قرآن نہیں سمجھا جا سکتا۔

قرآن جس کا نام ہے وہ وہی چیز ہے جو اپنے واحد، متواتر، قطعی اور غیر تبدیل شدہ الفاظ کے ساتھ کروروں انسانوں کے ہاتھوں میں اور لاکھوں آدمیوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور دنیا کے ہزاروں انقلابات کے بعد بھی جو انشاء اللہ یونہی محفوظ رہے گا۔

بے شک اُس کی آیتوں کی ترتیب وہ نہیں ہے کہ جس ترتیب سے وہ نازل ہوئی تھیں مگر یہ بھی قرآن کی ساخت کا ایک غیر فانی معجزہ ہے کہ ترتیب بدل جانے کے باوجود اُس کے اعجاز کی اصل روح قائم و برقرار ہے اور اُس کی آیتیں اپنی منفرد شخصیتوں کے ساتھ بھی معارف کے جواہرات اپنے دامن میں لیے ہوئے اور زندگی کے راستوں مشعلیں روشن کیے ہوئے ہیں۔ والسلام

علی نقی النقوی عفی عنہ
۲۲ شعبان ۱۳۷۳ھ

تیسری مجلس

مسئلہ حیات النبیؐ اور واقعہ وفات رسولؐ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ اَبُو الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتِمِ النَّبِيِّيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ.

اَمَّا بَعْدُ

فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ الْمُبِيْنِ وَهُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِيْنَ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ.

خالق اپنے رسولؐ سے خطاب کر کے ارشاد فرما رہا ہے کہ یقیناً آپ .... بھی موت سے دوچار ہونے والے ہیں اور یہ جتنے اور لوگ ہیں یہ سب بھی موت سے دوچار ہوں گے۔

اس آیت کے مضمون سے متعلق سب سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مسلمان اکثریت کے درمیان ایک مہتم بالشان اختلافی مسئلہ حیات النبیؐ اور موت النبیؐ کا ہے اور میں نے ''مسلمان اکثریت اس لئے کہا کہ میں مسلمانوں کے جس اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں اس میں یہ مسئلہ اختلافی نہیں ہے۔

برادران اہلسنت میں جو لوگ یہاں موجود ہیں اس سے واقف ہوں گے کہ یہ مسئلہ بہت عظیم الشان مبحث بن گیا ہے جس میں باہمی مناظرے تک ہوتے ہیں اور طرفین سے رسالے ردّ و قدح میں شائع ہوتے ہیں کہ کچھ علماء حیات النبیؐ کے قائل ہیں وہ اسے ثابت کرتے ہیں اور کچھ

اس کی رد کرتے ہیں ایک طبقہ عوام کا وہ ہے جس نے اس مسئلہ کو جیسا میں نے بعض پوسٹروں میں دیکھا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے القاب میں داخل سمجھا ہے مثلاً سیرۃ النبیؐ کا جلسہ ہوگا، اسے یوں لکھتے ہیں کہ یہ جلسہ حیات النبیؐ کے ذکر مقدس کا ہے۔

میں نے جو کہا ہے کہ ہمارے درمیان اختلاف نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بارے میں حیات النبیؐ والے گروہ ہی سے اتفاق رکھتے ہیں اور وہ ہمارے یہاں کوئی اختلافی بات بھی نہیں ہے تو اب سوال یہ ہے کہ یہ قرآن تو تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ کوئی حدیث ہے تو قابل اختلاف ہوسکتی ہے یعنی اس میں قوی یا ضعیف کی بحث ہوسکتی ہے مگر قرآن میں تو مسلمانوں کے درمیان اس طرح کے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ جو چیز قرآن میں درج ہے، اس میں مسلمانوں کے دو قول ہو گئے۔ میں نے آیت ابھی پڑھی جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ بھی میت ہیں یعنی مرنے والے ہیں اور آیت قرآن کے ترجمے میں بھی کوئی اختلاف نہیں پھر حیات النبیؐ و موت النبیؐ کا مسئلہ محل اختلاف کیوں ہے؟

ظاہر ہے کہ نقطۂ اختلاف کوئی ایک ہے اور نقطۂ اتحاد کوئی دوسرا ہے لازماً اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حیات و موت کے کوئی دو مفہوم ہیں کہ ایک معنی سے موتِ رسولؐ متفق علیہ ہے اور ایک موت محل اختلاف ہے۔ جس کے مقابلہ میں ہم حیات النبیؐ کے قائل ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ موت کی لفظ جب ہم کہتے ہیں تو ایک معنی اس کے ہیں کمالاتِ حیات کا ختم ہونا۔ حیات کا خاصہ جو کمال انسانی کا ایک اہم جزو ہے کیا ہے؟ شعور و ارادہ اور حرکت و عمل تو جو موت النبیؐ کا قائل ہے وہ یہ کہتا ہے کہ جیسے کوئی بھی مرنے والا دنیا سے چلا گیا تو اس کو اس دنیا کی باتوں کی خبر نہیں ہے اور اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح پیغمبرؐ بھی جب دنیا سے اٹھ گئے تو اب نہ ہمارے اعمال و افعال کی انہیں اطلاع ہے، نہ اب ہمیں کوئی مدد پہنچا سکتے ہیں۔ اور نہ ہم تک کوئی فیض رسانی کر سکتے ہیں۔ جس کا یہ

تصور ہو وہ موت النبیؐ کا قائل ہے اور اس کے بالمقابل جو حیات النبیؐ کا قائل ہے، وہ کہتا ہے کہ اس دنیا سے اٹھ تو گئے مگر اس دنیا سے اٹھنے کے بعد بھی ان کے تعلقات ہم سے شعور و حرکت کے لحاظ سے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اب بھی ہماری صدا وہ سنتے ہیں۔ اب بھی وہ ہماری پکار پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ ہم ان سے التجا کریں تو وہ اللہ سے التجا کر کے ہماری مشکل کو حل کرا سکتے ہیں۔ جو اس کا قائل ہے وہ حیات النبیؐ کا قائل ہے۔

دوسرا مفہوم ہے موت کا جسمانی زندگی کے لحاظ سے وہ موت جس کے اعتبار سے شرع میں احکام اموات مرتب ہوتے ہیں۔ اس مفہوم کے لحاظ سے قرآن کہہ رہا ہے۔

"آپ بھی یقیناً مرنے والے ہیں" تو اب کون مسلمان ہوسکتا ہے جو اس کا قائل نہ ہو۔ کوئی قرآن کا ماننے والا، القرآن کتابی کا اعلان کرنے والا یعنی قرآن کو کتاب الٰہی ماننے والا کیونکر اس کا منکر ہوسکتا ہے اور پھر چاہے مجھے مسلمانوں کے خاص اختلافی مسائل پر کوئی تبصرہ منظور نہ ہو مگر؟

بنیادی طور پر اختلاف ہے، وہ سب کو معلوم ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر موت النبیؐ اس معنی سے ثابت نہ ہوتی تو خلافت کی بحث ہی کیوں اٹھتی؟ اگر وفات رسولؐ مسلم نہ ہوتی تو میراث رسولؐ کا سوال کیوں پیدا ہوتا؟ اگر موت کا تصور نہ ہوتا تو غسل میت کیوں ہوتا؟ اگر موت کا تصور نہ ہوتا تو قبرِ رسولؐ کا کیا سوال تھا؟ روضۂ رسولؐ کیوں بنتا؟ حج کے پہلے یا بعد زیارت کے کیا معنی ہوتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موت اختلافی نہیں ہے۔ وہ کوئی دیوانہ مسلمان ہوسکتا ہے جو قرآن کو مانتے ہوئے بھی اس موت کا منکر ہو۔

وہ حیات النبیؐ جس پر میرا ایمان ہے اور بہت سے مسلمان اسے مانتے ہیں، وہ موت کے پہلے مفہوم کے مقابلہ میں ہے۔ کوئی کہے کہ جو تشریح کی گئی حیات اور موت کی، یہ تو بالکل نئی بات ہے۔ حیات اور موت کے معنی تو بس وہی ہیں یہ کہ موت کے معنی ہیں علم و شعور اور حرکت و عمل کا ختم ہونا اور حیات کے معنی ہیں ان کمالات کا قائم رہنا۔ یہ تو ایک نئے معنی حیات اور موت کے ہیں تو

میں کہتا ہوں کہ ایک نقطۂ اجماع واتفاق تمام مسلمانوں کا یاد دلاؤں تو ماننا پڑے گا کہ یہ میری ایجاد نہیں ہے۔ دیکھئے اللہ کے صفات ثبوتیہ جو بچوں تک کو پڑھائے جاتے ہیں، ان میں عالم وقادر وغیرہ کے ساتھ ''حی'' ہے حَی کے کیا معنی؟ زندہ۔ تو کیا اس زندگی کے معنی جسم وروح کے باہمی تعلق کے ہیں؟ اس صورت میں تو خالق مرکب ہو جائے گا۔ پھر حی کی صفت توحید سے ٹکرائے گی۔ وہاں نہ جسم ہے نہ جسمانی روح تو پھر حیؔ کے کیا معنی؟ تو علمائے کلام لکھتے ہیں کہ حیؔ کا مفہوم درحقیقت مجموعہ ہے عالم وقادر کے مفہوموں کا۔ جب انھیں الگ الگ کر کے کہتے ہیں تو صفتیں بنتی ہیں، عالم اور قادر اور جب ان دونوں کو سمو کر کہتے ہیں تو حیؔ ہو جاتا ہے۔ تو اب آپ سمجھے کہ علم وقدرت جس میں قائم ہوا اسے کہتے ہیں حیؔ۔ اب میں کہتا ہوں کہ جس معنی میں عالم وجوب میں، وہ حیؔ ہو۔ اس معنی میں عالم امکان کے بعد وفات پیغمبرؐ حی میں تو اب بڑا ہولناک جملہ کہوں گا اور کسی فتوے سے نہیں ڈروں گا وہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ جب اس دار دنیا میں تھے تو حیات میں ہمارے شریک تھے اور بعد وفات حیات میں اس کے شریک ہو گئے۔ میں نے کہا کسی فتوے سے نہیں ڈروں گا۔ حالانکہ شرک سے یقیناً میں بھی ڈرتا ہوں اور ڈرنا چاہئے مگر شرک سے ڈرتا ہوں۔ الزام شرک سے نہیں۔ یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے شریک ہو گئے تو اگر یہ سمجھوں کہ بذات خود شریک ہوئے اور اس کے مدمقابل ہو گئے تو یہ بلاشبہ شرک ہے اور جب اس نے یہ صفت دی تو شرک کہاں رہا۔

ظاہر ہے کہ ایسا مہتم بالشان مسئلہ جس پر میں نے کہا۔ طرفین سے یہ کتابیں لکھی جاتی ہیں، اس کو میں مختصر وقت میں اور وہ بھی بطور تمہید پوری طرح کہاں پیش کر سکتا ہوں۔ پس آخر میں ایک معجزۂ رسولؐ جو متفق علیہ ہے پیش کر دوں۔ ایک تمہید کے ساتھ اور وہ تمہید یہ ہے کہ از روئے قرآن موت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ قبض روح جو موت کی خصوصیت ہے وہ ہر انسان کے لئے روز ہوتی ہے۔ یہ نیند ہماری کہ ہم سوتے ہیں از روئے قرآن اس میں بھی قبض روح ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰكُمْ بِالَّیْلِ یہ وہ ہے جو رات کے وقت تمہیں وفات دیتا ہے، اس سے

اگر وہ سی موت مراد ہو؟ تو اس میں رات کی قید کیا۔ دوسری جگہ ذرا تفصیل کے ساتھ موت اور نیند دونوں کے اتحاد اور فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی. (سورہ زمر:۴۲)

''اللہ وہ ہے جو تمام جانوں کو لے لیتا ہے۔ ان کے مرنے کے وقت اور جو نہ مریں تو ان کے سونے کے عالم میں تو روک لیتا ہے اسے جس کے مرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور جسے دنیا میں ابھی رکھنا ہے اسے واپس کر دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک کے لئے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات یعنی قبض روح روز ہوتی ہے۔ ہم ایک صورت سے روز مرتے ہیں مگر یہ موت اصغر ہے۔ اب وہ متفقہ معجزۂ رسولؐ کا ملاحظہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا میں سوتے میں بھی تمہیں اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح جاگتے میں دیکھتا ہوں۔ تو اب مجھے کوئی منطق وفلسفہ درکار نہیں ہے۔ ایک جملہ میں منزل استدلال کو طے کر کے آگے بڑھوں گا۔ یاد رکھئے جس کا خواب مثل بیداری ہو گا اس کی موت بھی مثل حیات ہو گی۔

اس عالم امکان میں موت جسمانی کے باوجود حیات کا ثبوت قرآن سے موجود ہے جو سب کے نزدیک مسلم ہے۔ وہ حیات شہداء ہے۔ شہداء کی حیات کیا اس معنی میں ہے کہ وہ اس موت سے بری ہیں جس معنی میں رسولؐ سے کہا گیا ہے۔ اِنَّكَ مَیِّتٌ یعنی موت جسمانی، تو اس موت سے شہداء بری ہوتے تو میراث کسی شہید کی تقسیم نہ ہوتی۔ اس موت سے بری ہوتے تو شہید کے لئے غسل نہ سہی، کفن نہ سہی مگر نماز جنازہ بھی کیوں پڑھی جاتی۔ دفن کیوں کیا جاتا۔ کسی شہید کی بیوہ کو پھر حق نہ ہو عقد ثانی کرنے کا۔ ان مسلمہ احکام شریعت اسلام سے ظاہر ہے کہ اس موت سے شہداء بھی بری نہیں ہیں۔ پھر بھی قرآن کیا کہہ رہا ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا.

جواللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، ''انھیں مردہ نہ سمجھو''

بَلْ اَحْيَآءٌ. بلکہ وہ زندہ ہیں اور صرف اَحْيَآء مجمل طور پر کہہ کے بات ختم نہیں کی بلکہ لوازم حیات بھی ثابت کئے ہیں کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے یہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔

اب ایک طبقہ ہے مسلمانوں میں جو فاتحہ اور نیاز وغیرہ سب کے بارے میں اس طرح سوال کرتا ہے کہ کیا مردہ کھاتا ہے؟ میں کہتا ہوں اگر کھاتا نہ ہوتو تو خدا کیوں کہتا: ''عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ'' اپنے پروردگار کے یہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔ اب کوئی کہے کہ آیت قرآن کی بنا پر ہم مانے لیتے ہیں کہ وہ کھاتا ہے۔ لیکن یہ کھانے تھوڑی کھاتا ہے جو ہم سینی میں لگا کر رکھتے ہیں تو ان کھانوں کا رکھنا تو بہر حال بیکار ہے اس کے جواب میں مجھے ماضی قریب اور حال کے ان مشکلات پر نظر کرنے کی دعوت دینا ہوگی جن کی وجہ سے ایک ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں نہیں جاسکتا۔ مگر انسانی حالات کی بنا پر اکثر ضرورت منتقلی زر کی رہتی ہے۔ کسی گھر کا باپ یہاں، بیٹا وہاں ہے کسی کی ماں یہاں ہے، بیٹا وہاں ہے، خصوصیت سے یہ صورت ہمارے ملک کی تقسیم کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ گھرانے بٹ گئے، گھر بٹ گئے، اس طرح اکثر کمانے والے وہاں گئے، کھانے والے یہاں رہ گئے۔ وہ چاہتا ہے بھیجنا مگر قانونی رکاوٹیں سدِ راہ ہیں۔ تو میں کوئی غیر قانونی ذریعہ تھوڑی بتاؤں گا۔ حالانکہ لوگ سیکھے ہوئے ہیں، میرے سکھانے کی حاجت کہاں ہے؟ مگر بالکل قانونی صورت ایک مجھے معلوم ہے۔ ان ملکوں میں جن سے مواصلاتی تعلقات قائم ہوں۔ ایسے بینک ہیں جو دونوں ملکوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ وہاں ایک فارم کی خانہ پری کر کے داخل کیا جائے۔ وہاں سے اجازت نامہ مل جائے گا کہ وہ بینک آپ سے روپیہ لے کر وہاں بھیج دے۔ اب ہمارے یہاں کے نوٹ اگر وہاں بھیجے جائیں تو اس ملک میں چل نہیں سکتے۔ لہٰذا آپ بینک میں اپنے یہاں کے نوٹ داخل کریں گے اور وہ امانت داری کا فرض ادا کرنے کے لئے وہاں کے نوٹوں کی شکل میں اس تک

پہنچائے گا۔ جسے ہم نے بھیجا تھا۔ بس اسی طرح یاد رکھئے کہ ہمارے بس میں وہاں کی غذائیں نہیں ہیں، ہم تو وہی اپنی یہاں کی غذائیں پیش کرتے ہیں مگر عالم الضمائر خدا ہماری غذاؤں کو ہم سے لے کر امانت داری کے ساتھ وہاں کی مناسب حال غذاؤں کی شکل میں بدل کر پہنچا دیتا ہے۔

بہر حال سابق بیان سے ظاہر ہو گیا کہ حیات جسمانی اور اس کے مقابل کی موت اور ہے اور حیات بمعنی بقائے کمالات زندگی اور اس کے مقابل کی موت اور ہے۔ اب یاد رکھنا چاہئے کہ یہ موت جو سلب کمالات کے معنی میں ہے، اس سے اگر ہم ایمان کے جادہ پر قائم ہیں تو ہمیں سابقہ ہی نہیں پڑتا ہم جس کا چالیسواں کر رہے ہیں، اسے بھی اس معنی میں نہیں سمجھتے کہ مر گیا ہے۔ وہ جس کے لئے عزیز و احباب گریاں ہوتے ہیں، وہ بھی اس موت پر نہیں روتے اس لئے کہ ہمارے پیغمبرؐ کی حدیث ہے اور وہ حدیث بھی ایسی ہے جس کو امام فخر الدین رازی تفسیرِ کبیر کے ڈیڑھ صفحہ میں درج کیا ہے اس کا یہ ایک جملہ ہے جو ہم میں سے بہت سے افراد کو بفیض مجالس حفظ ہوگا۔

مَنْ مَاتَ عَلٰى حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِيْدًا.

جو محبت آل رسولؐ میں دنیا سے اُٹھا، وہ شہید دنیا سے گیا۔

اب غور کیجئے کہ کیا یہ کسی تاریخی واقعہ کا بیان ہے کہ جو محبت آل رسولؐ میں مرا وہ ضرور کسی میدان جنگ میں گیا ہوگا اور ضرور وہاں تلواریں کھائی ہوں گی صاف ظاہر ہے کہ یہ تاریخی واقعہ کا بیان نہیں ہے۔ یہ حقیقت میں معانی بیان کے لحاظ سے استعارہ ہے۔ جس کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ تشبیہ میں جو نمایاں صفت مشبہ بہ کی ہوتی ہے وہ مشبہ میں ظاہر کی جاتی ہے۔ تو جناب! اب شہادت کی نمایاں صفت وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ یعنی حیات جاودانی تو یہ جو کہا گیا کہ مَنْ مَاتَ عَلٰى حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِيْدًا. اس کے معنی یہ ہیں کہ چاہے وہ بستر پر دنیا سے گیا ہو لیکن پھر بھی یہ نہ سمجھو کہ وہ مر گیا بلکہ جیسے شہید کو حیات جاودانی ہے، اسی طرح اس کے لئے بھی حیات جاودانی ہے۔

اب میں مجالس سوم و چہلم میں میت کا ذکر کرنے کا تو عادی نہیں ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مقصد مجلس اس تذکرہ سے پورا نہیں ہو سکتا اور پھر یہ مرحوم کہ شرکائے مجلس میں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جوان کی سیرت کا مجھ سے زیادہ قریب سے مطالعہ کئے ہوئے ہیں مگر یہ تمام حضرات شعراء نے بھی اپنے منظوم تاثرات میں ان کی خصوصیت ظاہر کی ہے کہ عزائے سید الشہداؑ کا انھیں بھی ذوق وشوق بحد عشق تھا۔ اور اپنے محدود تعلقات کے حدو میں مجھ کو بھی اس کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ سادگی کے ساتھ اپنے کندھے پر تولیہ ڈالے ہوئے لکھنؤ میرے پاس پہنچتے رہتے تھے مجلس کا وعدہ لینے کے لئے حالانکہ تنفس کے مرض کی زیادتی اب ہوئی تھی مگر اس وقت بھی پہنچتے تھے تو جیسے ہانپتے ہوتے تھے۔ اور اگر مجھے کبھی عذر ہوا تو بلا تکلف اور بغیر اصرار فوراً بے نیل و مرام واپس گئے، یہ جانتے ہوئے کہ عذر معقول یقیناً ہے لہٰذا اصرار سے فائدہ نہیں ہے اور جب موقع ہوا تو میں نے وعدہ کر لیا۔ ظاہر ہے کہ میرے یہاں اس ذوق وشوق کے ساتھ پہنچنے سے ان کا کیا فائدہ تھا؟ صرف یہ کہ میں ان کے یہاں آ کر ان ہستیوں کا ذکر کروں جن کے تذکرے کے وہ مشتاق تھے تو اس لئے مجھے یقین ہے کہ اپنی مجلس میں اپنے ذکر کو وہ خود اتنا پسند نہیں کریں گے جتنا کہ معصومین کے ذکر کو جن کے ذکر کو وہ اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے لہٰذا ان کا تذکرہ کرنا نہیں ہے مگر اتنا کہ جب وہ محبت اہلبیت جس پر ان کا کردار گواہ ہے تو ہمارے نزدیک وہ بھی زندہ ہیں۔

اب یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ وہ مرے نہیں ہیں تو پھر روتے کیوں ہیں۔ ہاں یہ ویسا ہی سوال ہے جیسے شہداء کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

روئیں وہ جو قائل ہوں ممات شہداء کے   ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

اس وقت کسی منطقی وفلسفی بیان کا اس موضوع پر موقع نہیں مگر ایک روزمرہ کی مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو موضوع مجلس کے لحاظ سے تو گویا ایک متضاد موقع کی مثال ہے۔ لیکن میرے مقصد کے لحاظ سے نہایت قریب اور ذہن کو حقیقت سے قریب لانے والی مثال ہے۔ آج کل شرفاء کے طبقہ میں کتنے ہیں جن کے سامنے مسئلہ لڑکی کی شادی کا نہ ہو لڑکی کی شادی نہ ہونا شرفاء کے طبقہ کے لئے ایک مہم بن گئی ہے تو جب تک شادی نہیں ہوتی اور دیر ہو رہی ہے۔ ماں باپ اور عزیزوں پر کیا گذرتی ہے؟ شب و روز فکر، کوشش اور کاوش۔ اب جناب! خدا نے وہ دن دکھلایا تو رخصتی کے وقت کون معتدل فطرت کے ماں باپ ہیں جو رو نہ رہے ہوں؟ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ مرنے کا رونا ہے۔

نہیں جدائی پر بھی رونا ہوتا ہے۔ دوستوں کو غم یہ ہے کہ ایک دوست پرانا جو ہمارے ساتھ روز رہتا تھا، چلا گیا، بچوں کو غم ہے کہ باپ کی شفقت جو تھی اس سے ہم محروم ہو گئے اور عزیز جو ہیں جس میں جو رشتہ ہو۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ شخصیت ایک اٹھتی ہے مگر پسماندگان میں سے ہر آدمی کے لحاظ سے ایک مستقل سانحہ ہوتا ہے۔ اس طرح موت ایک آدمی کی ہوتی ہے مگر سانحے بہت سے ہوتے ہیں۔ ایک بھائی سے بھائی جدا ہو گیا۔ یہ ایک سانحہ ہے۔ اولاد کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ یہ ایک سانحہ، اگر بیوی موجود ہو تو اس کا شریک حیات، رفیق زندگی، سرتاج اٹھ گیا یہ ایک سانحہ ہے تو ہر ایک فرد کے لحاظ سے سانحوں کی تعداد بڑھتی ہے۔

اب جس کے برکات وفیوض کا تعلق جتنا وسیع ہو، سانحوں کی تعداد اس ایک ذات کے اٹھنے سے اتنی زیادہ ہوگی تو یہ رونا اس کا ہوتا ہے۔ مرنے پر تھوڑی ہوتا ہے تو جس کی مجلس ہم کرتے ہیں، فاتحہ دلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجلس ماتم ہم کسی غیر کا نہیں کرتے، اسی کا کرتے ہیں جو محبت اہلبیت ہے اور جو ہر ایمان رکھتا ہے تو ہم اس کو مردہ نہیں سمجھتے۔ بس وہ ہمارے درمیان سے اٹھ گیا اسی لئے ہمارا اردو کا محاورہ یہاں بالکل حقیقت کے مطابق ہے کہ ہم موت کو انتقال کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمارے محفل سے چلا گیا چاہے اپنے نقطۂ نظر سے بہتر محفل میں گیا ہو۔ اس لئے اسے غم نہیں ہوتا، ہمیں ہوتا ہے۔ وہ شاید دنیا سے جاتے وقت ہنس رہا ہو لیکن ہم رو رہے ہیں۔ اور خوش نصیب وہ ہے جو خود ہنستا ہوا جائے اور دوسروں کو روتا ہوا چھوڑے اور یہی آدمی کی خوبی ہے کہ

جانے پر وہ خود خوش ہو اور لوگ غم کریں لیکن وہ موت جس کو میں نے موت عنصری کہا اس کے لئے قرآن کہہ رہا ہے اپنے رسولؐ سے کہ

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَاِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ.

جیسے سب دنیا کے جانے والے ہیں، آپ بھی دنیا سے جائیں گے ضرور اور یہ قرآن کی وہ آیت ہے جس کی بنا پر ہمارے شاعر نے بھی کہا ہے:

"جب احمد مرسلؐ نہ رہے، کون رہے گا"

قرآن حبیب الٰہی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی بناء پر میں اس آیت کو ایک غلط تصور کے دفعیہ کے لئے پیش کرتا ہوں وہ ایک غلط جذبہ ہم میں ہے جو نہ جانیں کس کس غلط ماحول میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ ہم موت کو بری چیز سمجھتے ہیں یعنی آپ کتنے ہی استعارے سے اور مجاز کے پردے ڈال کر کہئے کہ جب آپ مریئے گا تو تیوریوں پر بل آ جائیں گے۔ چاہے عمر کی کسی منزل میں ہوں۔ خود کتنی دفعہ کہتے ہوں کہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ لیکن دوسرا جب کہے تو ناگوار ضرور ہو گا۔ اور اگر ایسا بے درد ہے کہ بغیر استعارہ اور کنایہ کے کہہ دیا تو بدتمیز کا لقب مل جائے گا۔

بھلا ہم اور ہمارے مرنے کا ذکر ہمارے منہ پر! یہ تو میری ایسی عمر کے لوگوں کا حال ہے جو بزرگان روزگار میں شامل ہو چکے ہیں اور کہیں کوئی بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے کہہ دے کہ جب تم مرو گے اور کہیں باپ بیٹے سے یوں کہہ دے تو سب یہ کہیں گے کتنا بے درد ہے، بے رحم ہے تو اب دیکھئے کہ یہ جو ہماری ذہنیت ہے، کتنی غلط ہے، خالق سے بڑھ کر بھی کوئی معیار تہذیب کو جانتا ہے؟ مگر خالق کسی اور سے نہیں۔ اپنے حبیب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے۔ بغیر کسی مجاز کا پردہ ڈالے ہوئے منہ در منہ خود اس سے خطاب کر کے اِنَّکَ مَیِّتٌ یقیناً آپ مرنے والے ہیں اب اس کے بعد اگر ہماری ذہنیت ایسی ہو تو کیا یہ ذہنیت اسلامی ہے؟

اور اب عقلی طور پر اس تصور کا جائزہ لوں یوں کہ موت اگر برائی ہے تو کس کے لئے برائی ہے؟ جانے والے کے لئے برائی ہے، اس لئے ہم اپنی نسبت یہ کہنا برا سمجھتے ہیں کہ جب آپ جایئے گا یا جو رہ گئے یعنی وہ عزیز جن سے مرنے والے کی جدائی ہوئی ان کے لئے برائی ہے۔ آخر کس کے لئے برائی ہے؟ جو بھی شق تیار کیجئے، میں کہوں گا کہ اگر وہ برائی ہوئی تو خالق اپنے حبیب سے اسے گوارا نہ کرتا۔ کیونکہ کوئی اپنے دوست کے لئے برائی پسند نہیں کرتا۔ ہم بھی اپنے دوست کے لئے برائی گوارا نہیں کرتے۔ لیکن ہم عاجز ہیں۔ بغیر ہمارے اختیار کے کچھ صدمے اس کو پہنچ جاتے ہیں۔ مگر جو قادر مطلق ہو اور قضا پر اس کا قابو ہو، وہ آخر خضرؑ کو زندہ رکھ سکتا ہے، الیاسؑ کو زندہ رکھ سکتا ہے تو اپنے حبیب کو وہ چاہتا اور وہ موت کو برائی سمجھتا ہے تو اس برائی سے روشناس کیوں کراتا اور تمام سلسلۂ انبیاء میں یہ ہمارے رسولؐ کی خصوصیت ہے کہ انھیں اللہ نے حبیب کا درجہ عطا کیا اور یہ حضرت ابراہیمؑ کے درجہ خلت سے بڑا مرتبہ ہے اس لئے کہ اردو میں تو ترجمہ خلیل اللہ اور حبیب اللہ دونوں کا ایک ہوتا ہے اللہ کا دوست، لہٰذا ہماری سمجھ میں فرق کچھ نہیں آتا ہم سمجھتے ہیں، وہ خلیل اللہ ہیں، یہ حبیب اللہ ہیں۔ وہ بھی اللہ کے دوست یہ بھی اللہ کے دوست تو اس میں خاص رفعت کیا ہوئی مگر یہ عربی زبان سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے دونوں کے معنی اگرچہ دوست کے ہیں مگر خلیل اور حبیب کے معنی میں فرق ہے۔ خلیل کے معنی میں مضمر ہے طالب ہونا اور حبیب کے معنی میں مضمر ہے مطلوب ہونا۔ خلیل وہ ہے جو دوسروں کو چاہتا ہو اور حبیب وہ ہے جس کو دوسرا چاہے۔ خلیل اللہ کے معنی ہیں محب خدا اور حبیب اللہ کے معنی محبوب خدا۔ اب اہل دل سمجھ سکتے ہیں کہ زمین محبت کس آسمان پر پہنچ گئی۔ ایک وہ دوست جو خود طلبگار ہو اور ایک وہ جس کے آپ طلبگار ہوں، ان کے برتاؤ میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔

اس کی روزمرہ کی زندگی میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ حضور! فرض کیجئے آپ نے ماشاء اللہ ایک مکان بنایا جیسے ہمارے وصی بھائی مرحوم نے یہ عالی شان مکان تعمیر کیا تو اگر کوئی صاحب

ہوتے، جنھیں آپ سے تعلقات بڑھانے منظور ہوتے، کسی وجہ سے چاہے وقتی طور پر الکشن کی ضرورت سے تو وہ اس طرح کہتے کہ سنا ہے، ماشاء اللہ آپ نے ایک عالیشان مکان تعمیر فرمایا ہے دل چاہتا ہے ہم بھی دیکھیں۔ یعنی مکان بنوایا آپ نے اور دل ان کا چاہنے لگا دیکھنے کو اور آپ کہتے ہیں کہ جناب میں تو گھر پر کم رہتا ہوں۔ کہا جس وقت آپ فرمایئے، اس وقت میں حاضر ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا اچھا صاحب اس دن اس وقت آجایئے گا۔ اب بالکل وقتِ معین پر وہ حاضر ہو گئے تو آپ جیسے بھولے ہوئے ہیں۔ کہا آپ کیسے تشریف لائے۔ جواب ملا میں نے کہا تھا کہ آپ نے ماشاء اللہ جو مکان بنوایا ہے، اس کو دیکھنا چاہتا ہوں آپ نے کہا۔ اچھا صاحب، چلئے اگرچہ وقت کم ہے۔ لے گئے ادھر اُدھر سے مکان کچھ دکھا دیا اور کہا بس ملاحظہ فرمالیا، تشریف لے چلئے۔ یہ ہو گا وہ دوست جو طالب ہے اور اگر کوئی صاحب ایسے ہیں کہ کسی وجہ سے بانی مکان ان سے تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں تو وہ ملیں گے کہ میں نے ایک چھونپڑا بنایا ہے۔ جی چاہتا ہے آپ ملاحظہ فرمالیں اور اب وہ فرماتے ہیں مجھے فرصت کم ہوتی ہے اور یہ کہتے ہیں ارے جس وقت فرمایئے میں سواری بھیج دوں۔ اب وقت معین پر سفیر خاص مرکب خاص لئے ہوئے حاضر اور اب جیسے یہ سوئے ہوئے ہیں، محبت کے تقاضوں سے کون صاحبِ دل واقف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کوئی طلبگار ہوتا تو سوتا کیوں ہوتا، ٹہلتا ہوتا اب ان کی نیند بے چین کی گئی، اٹھائے گئے کہا کیسے آئے کہا جی بلایا ہے۔ سواری بھیجی ہے اچھا صاحب؟ پھر چلتے ہیں۔ اب پہنچے اور کہاں تک پہنچے۔ میں جہاں پہنچا نہیں ہوں تو اسے میں کیونکر بتاؤں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہاں تک پہنچے جہاں تک جانے کے تصور سے فرشتہ کے پر جلتے ہیں اور اب یہ ہیں کہ وہاں پہنچ کر ہر قدم پر رکے جاتے ہیں اور ادھر سے کہا جا رہا ہے کہ اور بڑھئے۔ اب پہلے تو میرا بیان عام انداز میں تھا کہ آپ کی بنوائی ہوئی عمارت ہے اور آپ کا دوست اس کے دیکھنے کی خواہش کرتا ہے یا آپ اپنے دوست کو اس کے دیکھنے کے لئے بلواتے ہیں۔ مگر انبیاء و مرسلین کی منزل میں میرا بیان بالکل بے

قیمت ہے اگر کوئی قرآنی شاہد نہ پیش کر سکوں تو اب سنئے کہ قرآن کہہ رہا ہے: سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ ''پاک ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو'' پھر بدقسمتی سے مسلمانوں کے درمیان ایک اختلافی بات یاد آگئی۔ مسلمانوں میں اختلاف ہے کہ رسول کو معراج جسمانی ہوئی یا روحانی؟ میں کہتا ہوں کہ معراج کے ماننے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی نہ کہ قرآن میں موجود ہے اسی لئے کسی غیر مسلم کو ہم معراج نہیں منوائیں گے۔ اس رسالت پر بحث کریں گے انھوں نے رسول کو رسولؐ مانا ہی نہیں۔ نہ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں تو ان سے معراج کے مسئلہ پر کیوں گفتگو کریں۔ مگر مسلمان، جب اس نے رسالت مان لی ہے، قرآن کو کلام خدا مان لیا ہے تو اب مسلمان سے گفتگو کا محل ہے کہ جب معراج کو اس لئے مانا ہے کہ قرآن میں ہے۔ تو اب جو قرآن میں ہو، وہ مانئے، ورنہ بے اصولی ہے۔ قرآن کہہ رہا کہ ہے کہ پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا، اپنے بندہ کو۔ اب بندہ اگر بحالت حیات نام فقط روح پر ہوتا ہو تو مانئے کہ روح گئی اور اگر بندہ نام روح و جسد کے مجموعہ کا ہے تو پھر مانئے کہ پیغمبرؐ اپنے جسم سمیت معراج میں تشریف لے گئے۔

ہاں پھر سنئے: اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ ''لے گیا اپنے بندہ کو'' کہاں سے لے گیا؟ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ''مسجد محترم سے'' کہاں تک لے گیا اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ.

اس بلند ترین مرکز مسجود تک جس کے گرد و پیش برکت ہی برکت ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیوں لے گیا؟

لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ''تا کہ اپنی کچھ قدرت کی نشانیاں انھیں آنکھوں سے دکھائیں''...... یہ ہے حبیب کی شان کہ خالق خود مشتاق ہے کہ اپنی صناعیوں کا انھیں مشاہدہ کرائے۔

اب جو اپنا حبیب ہے، اس سے بے تکلف، بلا محابا، بغیر مجاز و استعارہ کی نقاب ڈالے ہوئے انتہائے تحقیق کے ساتھ وہ کہہ رہا ہے: اِنَّکَ مَیِّتٌ.

"بلاشبہ یقیناً آپ مرنے والے ہیں" تو اب یہ کوئی برائی ہوتی تو خالق اپنے حبیب کے لئے اسے کیوں گوارا کرتا۔ جو نام لے کر بھی کبھی انھیں نہ پکارے جبکہ نام لے کر ہر نبی کو پکارا ہو مگر ہمارے رسولؐ کو ایک دفعہ بھی نام لے کر نہ پکارے۔ ہمیشہ القاب و اوصاف وغیرہ سے تخاطب کرے، وہ اس طرح سے کہے کہ یقیناً آپ مرنے والے ہیں، تو اب کون ایسا ہے، جس کی شان کے خلاف ہم موت کو سمجھیں؟ جب پیغمبرؐ کے لئے وہ کوئی برائی نہیں تو کسی دوسرے کے لئے وہ کیا برائی ہو سکتی ہے؟ اور اگر پسماندگان کے لئے یہ کوئی برائی ہے یعنی جس کے عزیز کا ساتھ چھوٹا ہے اس کے لئے تو میں کہتا ہوں کہ یہ اگر کوئی برائی ہوتی تو پیغمبرؐ کو کسی کی جدائی کا داغ نہ اٹھانا پڑتا حالانکہ زیادہ تر افراد ایسے ملیں گے جنھیں کبھی ایک قسم کا صدمہ اٹھانا پڑا ہو اور ہمارے پیغمبرؐ کو تو جتنی قسم کے صدمے ہیں سب اٹھانا پڑے۔ سب سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھا۔ کوئی یتیم ہوتا ہوگا کسی خاص عمر میں اور ہماری شرع کے لحاظ سے یہ ہمارا محاورہ بالکل غلط ہے کہ جب بھی باپ کا سایہ سر سے اُٹھے تو ہم اس کی اولاد کو یتیم کہتے ہیں یہ شرعی حیثیت سے درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہاں یتیم میں نابالغ ہونے کی شرط ہے۔ بالغ افراد باپ کے انتقال سے شرعاً یتیم نہیں قرار پاتے۔ بہر حال شرعاً یتیم ہونے میں بچپن کی جو شرط ہے اس میں آخری حد پندرہ برس تک کی ہے یعنی اس سے کم جو بھی عمر ہو، وہ نابالغ ہے لہٰذا باپ کا سایہ اٹھا تو وہ یتیم ہو گیا۔ لیکن ہمارے پیغمبرؐ وہ تو ابھی شکم مادر میں تھے دنیا میں آئے بھی نہ تھے کہ باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ یعنی آپ پیدا ہی ہوئے دنیا میں یتیم۔ اب عام واقعہ ہے کہ جب باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو ماں اپنے کو دو شفقتوں کی ذمہ دار سمجھنے لگتی ہے۔ یعنی اسے اپنے بیٹے ہونے کے علاوہ یہ احساس بھی برابر ہوتا ہے کہ یہ بن باپ کا ہے مگر ہمارے پیغمبرؐ چھ برس کی عمر کے ہیں کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ جاتا ہے۔

جناب آمنہ بنت وہب مدینۂ منورہ اپنے میکے گئی تھیں اور وہاں سے واپس ہو رہی تھیں تو ابھی مکۂ معظمہ تک پہنچیں نہ تھیں کہ مقام ابوا ایک جگہ ہے مکہ سے باہر وہاں وفات ہو گئی۔ اب اس سلسلہ میں ایک متفق علیہ تاریخ کا واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ یاد رکھئے چھٹا برس تھا۔ اب کمالات

رسالت کے لحاظ سے نہیں۔ عام بشری زندگی کے لحاظ سے کوئی دیکھے تو ۶ برس کی عمر وہ ہوتی ہے کہ اس وقت کی باتیں بہت مدت گذرنے کے بعد یاد نہیں رہا کرتیں۔ آپ چالیس برس کی عمر میں مبعوث برسالت ہوئے ہیں تو ماں کی وفات کے چونتیس برس کے بعد بعثت ہوئی ہے اور بعثت کے ۱۳ برس کے بعد ہجرت ہوئی ہے اور ہجرت کے آٹھ برس کے بعد فتح مکہ ہوئی ہے تو کتنی طولانی مدت ہو گئی، مگر اس مدت کے بعد جب فتح مکہ ہوتی ہے تو زندگی کے چھٹے برس جس ماں کا انتقال ہوا تھا، اس کی یاد اتنی شدت سے ہے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کے لئے اجازت مانگی اور اللہ نے مجھے اجازت عطا فرمائی ہے لہٰذا میں جا رہا ہوں اور اب جتنے حاضر الوقت اصحاب ہیں، وہ سب رسولؐ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اجازت تو رسولؐ نے اپنے لئے حاصل فرمائی تھی یہ اصحاب کیوں جا رہے ہیں؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ تو جا رہے ہیں اذن الٰہی سے اور اصحاب جا رہے ہیں باتباع رسولؐ اور اب رسولؐ اس عمر میں دنیا سے اٹھی ہوئی ماں کے غم میں جب قبر پر ماں کی پہنچتے ہیں تو گریہ فرما رہے ہیں اب ہمت ہو تو رسولؐ پر فتوے جاری کریں۔ رسولؐ گریہ فرما رہے ہیں اور اس وقت کے جتنے اصحاب ہیں وہ پیغمبرؐ کے ساتھ شریک گریہ ہیں۔

میں مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہوں کہ رسولؐ کو کہہ لیجئے کہ بتقاضائے بشریت رو رہے ہیں۔ اس لئے کہ بیٹے ہیں، ماں کو یاد کیا ہے لیکن یہ اصحابؓ کیوں رو رہے ہیں۔ ان کا کوئی رشتہ جناب آمنہ سے نہ تھا۔ ان کو کوئی نسبی تعلق نہ تھا، ماننا پڑے گا کہ یہ رسولؐ کو روتا دیکھ کر بہ اتباع رسولؐ ان کے تاثر سے گریہ کر رہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ فعل رسولؐ چاہے بہ تقاضائے بشریت ہو لیکن یہ دوسروں کا گریہ تو بہ تقاضائے ایمان ہی ہے۔ لہٰذا بلاشبہ عبادت ہے۔ اب دنیا فیصلہ کرے کہ ماں کے غم میں رسولؐ رو رہے ہیں تو مسلمان بہ اتباع رسولؐ بغیر اندیشۂ الزام بدعت گریہ کریں اور پیغمبرؐ معترض نہ ہوں اور رسولؐ اپنے نواسے پر گریہ کر رہے ہیں اور ایسا کہ عمر بھر روتے رہے ہوں تو اب مسلمان یہ سوچیں کہ ہمارے واسطے گریہ سنت ہے یا بدعت؟

حضور! اب مجھے بیان کو سمیٹنا بہت ضروری ہے۔ وقت اب بہت کم رہ گیا ہے۔ ماں کا سایہ اٹھ گیا، اب رسول گا سن ہوا آٹھ برس، دو برس ماں کے گذرنے کے بعد دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ جناب عبدالمطلب نے کس شان سے تربیت کی ہے؟ اس شان سے ظاہر ہے کہ فقط دادا پوتے کی تربیت جس شان سے کرتا ہے اس طرح نہیں کر رہے ہیں بلکہ عجیب خصوصیت ہے۔

طبقات ابن سعد طبری سے بھی مقدم کتاب ہے جو فقط مصر میں نہیں بلکہ ہالینڈ میں بھی چھپ چکی ہے۔ طبری چوتھی صدی کے عالم ہیں اور ابن سعد تیسری صدی کا مورّخ۔ وہ لکھتا ہے: جناب عبدالمطلب بڑے جاہ وجلال کے آدمی تھی، کعبہ کی دیوار سے ملا کر ان کی مسند بچھتی تھی۔ تمام معززین عرب اس کے گرد آکر بیٹھتے تھے۔ گویا دربار ہوتا تھا۔ تو جب تک عبدالمطلب برآمد نہ ہوں ان کے کسی بیٹے کی مجال نہ تھی کہ اس مسند پر آکر قدم رکھے لیکن اس کمسنی کے عالم میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آتے تھے تو سیدھے اس مسند کی طرف جاتے تھے۔ کبھی ایسا ہوا کہ جناب عبدالمطلب آتے ہوئے اور کسی نے اولاد عبدالمطلب میں سے، آپ کے چچا تھے، ہٹانا چاہا ادھر عبدالمطلب نے دیکھا تو کہا: دَعُوْهُ فَاِنَّ لَهٗ شَانًا کَبِیْرًا. ارے اسے چھوڑ دو۔ اس کی بڑی شان ہے۔ بڑی شان، کہنے سے پتہ چل گیا کہ دادا پوتے کو نہیں پال رہا ہے بلکہ عارف شان صاحب شان کی پرورش کر رہا ہے۔ اب عبدالمطلب دنیا سے اٹھ رہے ہیں اور ان کے دس بیٹے ہیں اسی لئے اَبُو السَّادَةُ الْعَشَرَة کہے جاتے ہیں مگر تمام بیٹوں میں مخاطب ہوتے ہیں ایک کی طرف، اے ابوطالب ابھی تک میں اس کی پرورش کر رہا تھا۔ اب میں اس کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ تم اس کی پرورش کرنا، میں کہتا ہوں کہ جناب عبدالمطلب ایسا صاحب بصیرت جو تینتیس ۳۳ برس بعد کی شان کے ایک بچہ کا اندازہ کر رہا ہے، وہ اپنے بیٹوں کی حالیہ شان کو نہیں جانتا؟ ماننا پڑے گا کہ ان کی مردم شناس نگاہ دیکھ رہی تھی کہ اس شان کی جس کا عارف میں ہوں معرفت میرے تمام بیٹوں میں سے ایک اسی کو ہے۔ اب جناب ابوطالب جو حقیقی چچا ہیں تربیت وکفالت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور اب ان کی تربیت کی عمر اتنی طولانی ہے کہ پہلے فطرت کی زبان میں کہوں کہ اس تربیت کے دوران میں رسول کا بچپنا جوانی

سے گلے مل رہا ہے اور اب مسلمانوں کے ایک مکتب خیال کی زبان میں کہوں کہ پھر انہیں کے دور تربیت میں بشریت رسالت سے گلے ملتی ہے اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی. اللہ اپنے احسانات میں کہہ رہا ہے کہ اللہ نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ نہیں دی؟

اب یہاں مفسرین چاہے جس مکتب خیال کے ہوں، چاہے جلالین ہوں، چاہے نیشاپوری ہوں، چاہے رازی ہوں اور چاہے کوئی اور ہوں یہاں مجبور ہے ہر مفسر کہ "اللہ نے یتیم پایا آپ کو تو کیا پناہ نہیں دی؟ اس کے تحت میں عبدالمطلب کا نام نہیں لکھتا۔ ماں کا ذکر نہیں کرتا، کیونکہ جب خدا احسان جتائے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دو، چار، چھ برس میں ختم ہو جائے۔ بلکہ وہ لکھتا ہے بِعَمِّهٖ اَبِیْ طَالِبٍ. (یعنی) آپ کو پناہ دی۔ آپ کے چچا ابوطالب کے ذریعہ سے اب میں ایک لفظ کی طرف توجہ دلاؤں گا کہ یہ رواداری کا ترجمہ ہے جو میں یہ کہوں کہ یتیم پایا تو اللہ نے پناہ دلوائی اٰوٰی کے معنی "پناہ دلوائی" نہیں ہیں بلکہ اللہ نے پناہ دی۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بڑی منزل بلند ہے انسان کی، فعل ہو انسان کا اور اللہ اپنا فعل کہے۔ ہم رسولؐ کے لئے مقام بیان فضیلت میں کہتے ہیں کہ:

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی.

وہ آپ نے سنگریزے نہیں پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے۔

اس میں اللہ نے پیغمبرؐ کے کام کی نسبت اپنی طرف دی ہے یہاں بھی پناہ دینا تو ابوطالب کا عمل ہے۔ مگر خدا کہتا ہے اس نے پناہ دی وہی بات ہے کہ عمل بندہ کرتا ہے اور اللہ خود اپنا عمل کہتا ہے۔

یہ ایک نوعیت کے یعنی بزرگوں کے صدمے تھے۔ اب انہیں جناب ابوطالب نے رسولؐ کی جو شادی کی تھی اور وہ صرف ایک خاتون تھیں جن کے ساتھ ابوطالب نے رسول کا عقد کیا تھا۔ جناب خدیجہؑ اور ان کا ایثار اسلام کی راہ میں وہ تھا کہ اسی سورہ میں اس کا ذکر بھی فرمایا گیا: اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ذرا اسی بعد ارشاد ہوا: وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی. اس نے اپنے آپ کو پریشان حال پایا تو دولتمند بنایا۔

یہاں بھی مفسرین یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ دولتمند کیا خدیجہ کی دولت کے ذریعہ سے۔ یہ وہ پاک کمائی تھی جسے اللہ نے اپنے رسولؐ کے لئے سرمایۂ دین اسلام بنانے کے لئے تجویز فرمایا۔ یہ عدل الٰہی ہے کہ وہ دو ہستیاں ایک دوسرے کی شریک حیات ہونے کے اعتبار سے ہمسر تھیں، ایک ہی سورہ میں۔ ان میں سے ایک کے باپ کا ذکر کیا تو دوسرے کی ماں کا۔ ماشاء اللہ مجالس کا ذوق رکھنے والوں کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے مگر ان کے لئے جو نووارد ہیں فی الجملہ تشریح کردوں کہ وہ ابوطالب کا ذکر تھا۔ جو حضرت علیؑ کے والد بزرگوار ہیں اور یہ حضرت خدیجہؓ کا ذکر ہے جو جناب فاطمہ زہراء کی والدۂ ماجدہ ہیں۔

ایک ہی سورہ میں اللہ نے دونوں کا جو اسلام پر احسان ہے اس کا تذکرہ، اب قرآن تو ان کے احسان کی قیامت تک کے لئے یاد محفوظ رکھنا ضروری سمجھے اور ہم ایسے احسان ناشناس ہوں کہ ان کے ایمان کو قابل بحث قرار دیں۔ بہرحال یہ بی بی اور وہ سرپرست چچا جو پہلے ذات پیغمبرؐ کی حفاظت کے کفیل تھے اور اب آپ کے پیغام کی حفاظت کے ذمہ دار بن گئے۔ ابھی تک تربیت بانیٔ اسلام کر رہے تھے اور اب تربیت اسلام میں ان کے معاون و مددگار بلکہ سینہ سپر بلکہ قلعۂ حفاظت ہیں۔ متفق علیہ تاریخوں کے لحاظ سے جناب ابوطالب اور جناب خدیجہ، دونوں ہستیاں تقریباً ایک ساتھ فدیۂ اسلام ہوئیں۔ یعنی اس چار برس کے محاصرہ شعب ابی طالب سے جب کئی کئی وقت غذا نہیں ملتی تھی، باہر نکلے تو ایک مہینے کے اندر وہ بی بی بھی دنیا سے اٹھیں اور وہ چچا بھی جان بحق تسلیم ہوئے اور پیغمبرؐ کو اتنا صدمہ ہوا کہ اس سال کا نام ''عام الحزن'' ہوگیا۔ غم کا سال۔ اور یہ ناواقف مسلمانوں کے لئے کہتا چلوں کہ تاریخ اسلام میں کوئی خوشی کا سال ہمیں معلوم نہیں مگر غم کا سال جزِ تاریخ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوشی کی بات اتنی یاد رکھنے کی نہیں ہے۔ جتنی غم کی بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب یہ دوسری قسم کا صدمہ یعنی شریک حیات اور رفیق زندگی کا ہے۔ اور پیغمبر نے آخری دورِ حیات تک اس بیوی کو یاد کیا متفق علیہ واقعات ہیں کہ برابر خدیجہ کا ذکر فرماتے رہے۔ جو خدیجہ کی ملنے والی عورتیں تھیں۔ وہ کبھی آجاتی تھیں تو دیر دیر تک ان سے تذکرے ان کے رہتے تھے یہ تھا

تقاضائے بشریت یا نفسانیت کہ کچھ حاضر الوقت شخصیتوں کو گراں گذر گیا اور پیغمبرؐ سے کہا کہ یہ کب تک آپ ایک بوڑھی عورت کو یاد کرتے رہیں گے۔ آپ کو اللہ نے اس سے بہتر عطا فرمادی۔ یہ سن کر صاحب خلقِ عظیم کی جبین پر شکن آگئی۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا: ارے اس سے بہتر کا کیا ذکر، اس کے مثل بھی مجھے نہیں ملی۔ اور اس کے بعد خدیجہ کے جوہر کردار کو ان کی بلندی کے اظہار میں پیش فرمایا جس سے یہ اصول ثابت ہوگیا کہ عورت کی حقیقی مدح کیا ہے؟ ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ صَدَّقَتْنِیْ اِذَا كَذَّبَ النَّاس.

اس نے میری اس وقت تصدیق کی جب دنیا جھٹلا رہی تھی۔

وَاٰمَنَتْ بِیْ اِذَا كَفَرَ النَّاسُ.

وہ اس وقت ایمان لائی جب دنیا کافر تھی۔

اور آخری جملہ یہ ہے:

رَزَقَنِیَ اللّٰهُ فِیْهَا اَوْلَادًا.

اور اللہ نے اس سے مجھے اولاد عطا کی۔

اس سے بڑھ کر رفعت کسی اور خاتون کی کیا ہوسکتی ہے۔

عمر بھر صدمہ ان بیوی کا رہا اور چچا کو بھی بعد میں جب موقع آیا یاد کرتے رہے یہ بھی ذکر ہے تاریخ میں کہ مدینہ میں قحط پڑا۔ بارش کے لئے رسولؐ نے دعا کی جس سے بارش ہوئی۔ لوگ رسول کو مبارکباد دے رہے تھے۔ آپ فرماتے ہیں: ارے کوئی ہے جسے میرے چچا ابوطالب کے وہ اشعار یاد ہوں۔ یہ اشعار قصیدۂ لامیہ میں ان کے ہیں جو آج تک محفوظ ہے۔ انہیں میں سے ایک شعر یہ ہے:

وَاَبیَضَ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ثِمَالُ الْیَتٰمٰی عِصْمَةٌ لِلْاَرَامِلِ

رسولؐ کی مدح میں فرماتے ہیں: ''وہ گورے رنگ والا'' اس میں وہ فطری کیفیت ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک بڑا بوڑھا اپنے ایسے خورد کی جو مثل اولاد ہے تعریف کر رہا ہے

اوراب اس کی شان بلند کا اظہار ہے کہ جس کے چہرہ کے بدولت ابر سے پانی طلب کیا جاتا ہے۔وہ یتیموں کا خبر گیراور بیواؤں کا دستگیر ہے۔ابوطالب کا شعر آپ اس وقت یاد کر رہے ہیں، جب مدتیں گذر چکی ہیں چچا کو دنیا سے گئے ہوئے۔

اس کے علاوہ، اولاد کے صدمے تو سب جانتے ہیں کہ جناب خدیجہ سے اللہ نے کئی بیٹے آپ کو عنایت فرمائے تھے۔طیب، طاہراور ایک روایت میں ایک فرزند کا نام اپنے والد بزرگوار کے نام پر رکھا تھا عبداللہ اور قاسمؑ جن کے نام پر آپ کی کنیت ہے ابوالقاسم جن کا داغ پیغمبرؐ نے اٹھایا۔ تو اب کون صدمہ ہے جو رسولؐ نے نہ اٹھایا ہو اور اب کون سی موت ہو سکتی ہے جسے برائی سمجھا جائے مگر یاد رکھئے کہ برائی ہونا نہ ہونا دماغ کا فیصلہ ہے اور گریہ ہونا دل کا تقاضا ہے اسلام دین فطرت ہے۔دماغ سے مطالبہ ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھے مگر دل کی فطرت کا جو تقاضا ہے، وہ ممنوع نہیں ہے۔ رونے کا حق تمہیں ہے، یہ محبت نہ رکھنے والا دل ہے جو منطقی اعتراض کراتا ہے۔چاہنے والا نہیں کہے گا کہ زندہ جاوید کو کیوں روتے ہو؟ میں کہتا ہوں کہ فاطمہؑ زہراء کیا رسولؐ کے مرتبہ سے معاذ اللہ واقف نہیں ہیں پھرانھوں نے گریہ کیوں فرمایا۔

اب یہ اپنے گھر کے ایک بزرگ کی مجلس ہے لہٰذا خاندان رسالت کی جو بزرگ ترین فرد ہے، اس کی وفات کے سلسلہ میں مصائب عرض کرنا چاہتا ہوں۔

یقیناً کوئی بیٹی باپ کو اتنا نہیں روئی، جتنا فاطمہؑ زہراء اپنے باپ پر گریاں رہیں۔

اب یہاں کتابوں میں ایک ایسا واقعہ درج ہے جسے پڑھ کر نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے ہمارا دل چاہتا ہے۔یہ ورق نہ ہوتا۔حضور! محلہ میں بہت سے اجنبی رہتے ہیں جن سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات شناسائی بھی نہیں ہوتی، پھر بھی ان کے یہاں کوئی سانحہ ہو، گھر والے رو رہے ہوں تو کون پڑوسی ہے جو اس دن خوشی کے ساتھ کھانا کھائے؟ کون پڑوسی ہے جو اطمینان کے ساتھ سوئے ایک گھر میں کہرام پڑا ہے تو نیند تو ہمسایہ کی حرام ہوگی۔مگر بخدا آج ہماری تہذیب اور انسانیت گوارا نہیں کرے گی کہ اس گھر والوں کے پاس جائیں اور ان سے

کہیں کہ تمہارے رونے سے ہماری نیند اڑتی ہے، تمہارے رونے سے ہمیں کھانے میں مزہ نہیں ملتا لہٰذا تم رونے میں کمی کرو، مگر کیا کیا جائے، یہ واقعہ ہے کہ عظیم ترین معلم اخلاق دنیا سے گیا، اس کی بیٹی اپنے باپ کے غم میں رو رہی ہے تو اہل محلّہ کا وفد آتا ہے۔علیؑ کے پاس "یا علیؑ! ہماری طرف سے جا کر فاطمہؑ زہراء سے کہئے کہ ان کے دن رات رونے سے ہمیں کھانے پینے سے نہ مزہ ملتا ہے اور نہ ہم رات کو اطمینان سے سو سکتے ہیں، یا دن کو روئیں، رات کو خاموش رہیں یا رات کو گریہ کریں دن کو خاموش رہیں۔اب اندازہ کیجئے۔انسانی فطرت کے لحاظ سے ہم اور آپ کو اس ذکر سے کتنی تکلیف ہوتی ہے تو علیؑ کے دل پر کیا گذری؟ مگر وہ تو رسولؐ امین کے جانشین تھے۔آپ نے فرمایا کہ تمہارا پیغام جا کر پہنچائے دیتا ہوں اب حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے باقتضائے بلاغت کتنا ہی ہلکا کر کے اس پیغام کو پہنچایا ہو۔لیکن بات تو وہی کہنا تھی۔اس کے بعد فاطمہؑ زہرا کے دل پر کیا گذری؟ مگر وہ صاحب خلق عظیم کی بیٹی تھیں۔انھوں نے زبانی تو یہ جواب دیا کہ فرمایا: ان لوگوں سے کہئے کہ تمہاری زحمت کی عمر طولانی نہیں ہے۔ مجھے میرے بابا خبر دے گئے ہیں کہ میں بہت جلدی ان کی خدمت میں چلی جاؤں گی۔جواب تو یہ دیا لیکن خود ان کی ایک ناروا فرمائش کا گویا احترام اتنا کیا کہ دوسرے دن سے صبح کو بیٹوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ساتھ جنت البقیع چلی جاتی تھیں۔اب یہاں ایک نفسیاتی حقیقت ہے جسے راویوں نے چاہے بیان نہ کیا ہو مگر اس سے کہ بیٹوں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔میرا ذہن اس صورتِ واقعہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ ہوتا یہ تھا کہ فاطمہؑ نے اپنے باپ کو رونا شروع کیا تو بچے بھی شریک ہو گئے رونے میں اور بس ایک مجلس برپا ہو گئی۔اب سیدۂ عالم ان اہل محلہ کی فرمائش کی امکانی تعمیل کرنا چاہتی ہیں مگر رونے پر قابو نہیں ہے کہ رونے کے لئے اوقات مقرر کریں۔ہاں گھر میں اپنے رہنے کا وقت مقرر کرتی ہیں کہ میرے گریہ کی آواز جو ان تک مسلسل پہنچتی ہے جو ان کے لئے پریشان کن ہے۔وہ کم از کم دن میں ان تک نہ پہنچے لہٰذا صبح کو جنت البقیع چلی جاتی ہیں اور وہاں شام تک روتی ہیں اور اب چاہتی ہیں کہ جو شرکائے مجلس ہیں، وہ بھی میرے ساتھ رہیں اور جب رات ہوتی ہے تب گھر واپس آتی ہیں۔بس آخر میں یہ تذکرہ سن لیجئے کہ بلال

نے جو موذن رسولؐ تھے عہد کرلیا کہ وہ رسولؐ کے سوا کسی کے لئے اذان نہ کہیں گے سمجھتے تھے کہ مدینہ میں رہ کر اس کا نباہنا مشکل ہے لہٰذا مدینہ چھوڑ دیا، شام چلے گئے۔ وہاں رہنے لگے مگر جسے پیغمبرؐ سے اتنا لگاؤ تھا اس سے رسول کو لگاؤ نہ ہوتا؟ خواب میں رسول کو دیکھا فرماتے ہیں: ''ہم نہیں رہے تو تم نے ہماری ڈیوڑھی بھی چھوڑ دی؟'' یہ خواب دیکھا تو اتنے بیتاب تھے کہ بغیر سامانِ سفر درست کئے ہوئے پشت شتر پر سوار ہوئے اور روانہ ہوگئے اور تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر کسی ہم سفر یا راہ گیر نے جو اتفاقاً راہ میں مل گیا تھا، مدینہ جا کر رفتار سفر کا اندازہ لگاتے ہوئے اطلاع کردی کہ بلال فلاں دن پہنچ جائیں گے۔ تو روایت بتاتی ہے کہ اس دن پورا مدینہ امنڈ پڑا۔ پردہ نشین عورتیں تک گھروں سے نکل آئیں، استقبال بلال کو اور بلال پہنچ گئے۔

اب واقعات کی ایک کڑی ہے جس کی تاریخ نے بروقت بیان نہیں کیا تھا وفات رسولؐ کے موقع پر تاریخ کی پوری توجہ سیاسی سرگرمیوں پر مرکوز ہوگئی اب تاریخ کے راویوں کو کہاں فرصت تھی کہ وہ اس اثر کو بیان کرتے جو وفات رسول کا عام مسلمانوں پر ہوا تھا، کیونکہ عام مسلمان اس وقت کے جو سب صحابہ اور صحابیات تھے تو ان سب کو تو سیاست کی سرگرمیوں سے بذات خود کوئی تعلق نہ تھا۔ ان پر جو فطری اثر وفاتِ رسول کا تھا، اس کا پتہ اب چلتا ہے جب بلال کے آنے کے موقع پر تاریخ میں یہ جملہ آیا کہ:

مَا رُبِیَ مِنَّا یَفْقَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَكْثَرُ بَاكِيًا وَّبَاكِيَةً مِنْ يَوْمِ اَقْبَلَ بِلَالٌ.

(یعنی وفات رسولؐ کے بعد سے یہ کہرام رونے والوں اور رونے والیوں کا سنائی نہیں دیا جو آج تھا جب بلال وارد ہوئے۔)

تو اس جملہ سے معلوم ہوگیا کہ وفات رسولؐ کے موقع پر بھی سارے مدینہ میں یُس تھی اور عظیم کہرام شدت گریہ سے برپا تھا۔ اس کے بعد پھر یہ کہرام آج ہوا جب بلال آئے۔

اب سب تو بلال کے استقبال کو آئے ہیں اور بلال سیدھے روضۂ رسولؐ پر جاتے ہیں وہاں حسنؑ وحسینؑ نظر آئے۔ بلال نے شاہزادوں کو اٹھا کر کاندھوں پر چڑھا لیا۔ اب ہر ایک کہہ رہا

ہے کہ انھیں ہمیں دے دیجئے اور یہ کہتے ہیں، نہیں نہیں ارے میں نے تو رسول کو دیکھا ہے کہ انھیں کاندھوں پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ آج مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ آپ بہت مشاب ہو رہے ہیں۔ اب بلال کہاں آئے؟ وہاں جسے رسولؐ کی ڈیوڑھی سمجھتے تھے یعنی خانہ جناب سیدۂ عالم، اپنا سلام کہلوایا اور سیدۂ عالم نے جو سلام کے بعد کہلوایا کہ بلال! جب سے بابا کا سایہ اٹھا تمہاری آواز اذان بھی کان میں نہیں آئی۔ بلال نے جو واقعہ تھا عرض کرایا کہ مخدومۂ عالم سے کہو کہ رسولؐ کے بعد میںؔ نے عہد کرلیا ہے کہ اذان کسی کے لئے نہیں کہوں گا بس جو واقف ہیں، وہ واقف ہیں جو نہیں واقف ہیں ان کے لئے میں عرض کرتا ہوں کہ عہد امر شرعی ہے۔ فقہ کی کتابوں میں جیسے نذر کا باب ہے، قسم کا باب ہے اسی طرح عہد کا بھی باب ہے۔ اس کا بھی صیغۂ شرعی ہوتا ہے۔ حضور! بلال نے تکلفانہ کوئی عذر نہیں کیا تھا ایک امر شرعی کی مجبوری کا اظہار کیا تھا۔ اب سیدۂ عالم سے زیادہ واقف شرع کون ہوسکتا ہے؟

سیدۂ عالم نے فرمایا بلال سے کہو تمہیں میرے حق کی قسم ہے کہ ایک دفعہ میرے لئے اذان کہہ دو۔ نکتہ رس حضرات غور کریں میں کہتا ہوں بلال نے ایک امر شرعی پیش کیا تھا۔ سیدۂ عالمؑ نے یہ جملہ سن کر کہا۔ اب بلال پھر کہیں کہ میں کیا کروں میں نے تو یہ عہد کیا ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ اجتہاد کوئی عجوبہ چیز نہیں ہے جو آج نجف میں ہوتا ہے۔ ایران میں ہوتا ہے ممکن ہے ہندوستان میں بھی کہیں ہوتا ہو وہ فطرت کا تقاضا ہے۔ زمانۂ رسولؐ اور آئمہ میں بھی ہوتا تھا دلیل شرعی سے عقل سلیم اور ذہن مستقیم کی مدد سے نتیجہ نکالنا۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بلال عوام میں سے نہیں تھے وہ ملکۂ اجتہاد رکھتے تھے۔ انھوں نے سیدۂ عالم کا پیغام سنتے ہی ایک لمحہ میں منازل استنباط کو طے کیا۔ صغریٰ و کبریٰ مرتب کر کے نتیجہ نکال لیا۔ حدیث رسولؐ یاد آگئی کہ پیغمبر نے فرمایا ہے: فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّیْ جو صحیح بخاری میں بھی اب تک موجود ہے، فاطمہؑ میرا ایک جز ہے جس نے اس کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی۔ مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِیْ اور جس نے اس کو غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا وَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ. اس سے عقل کی مدد سے یہ کلیہ بنا

کہ جو بات فاطمہؑ کے لئے ہو، وہ رسولؐ کے لئے ہوتی ہے۔ اب بلال سوچے کہ میں نے یہی تو عہد کیا تھا کہ رسولؐ کے سوا کسی کے لئے اذان نہیں کہوں گا۔ ارشادِ رسولؐ سے سمجھ میں آتا ہے کہ فاطمہؑ کے لئے اذان دینا غیر رسولؐ کے لئے اذان دینا نہیں ہے۔ رسولؐ ہی کے واسطے ہے۔ پس ایک زمین برق رفتار کے ساتھ منزل اجتہاد طے ہوگئی اور بلال کو اطمینان ہوگیا کہ حضرت فاطمہؑ زہراء کے لئے اذان دینا میرے عہد کے خلاف نہ ہوگا لہٰذا فوراً کہہ دیا سَمْعًا وَطَاعَةً اب مخالفت ناممکن، بلال ماذنہ پڑ گئے اور اذان شروع کر دی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ مردوں کا اندازِ گریہ اور ہوتا ہے عورتوں کے بین کا طریقہ اور ہوتا ہے وہ کیسی ہی شخصیت ہو لیکن جو مرد ہے وہ مرد ہے جو عورت ہے وہ عورت ہے جس طرح کے بین حضرت فاطمہؑ زہراء کے لئے مناسب ہیں۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالب پر نہیں کھپ سکتے جونہی بلال کی آواز آئی ایک دفعہ فاطمہؑ نے کہا بابا بلال اذان دے رہے ہیں؟ آپ نماز میں جانے کی تیار نہیں کرتے؟ اور بس گریہ شروع ہوگیا۔ بلال آگے بڑھے: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فاطمہؑ کے گریہ میں اضافہ ہوا۔ اب بلال نے کہا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ اور بس اس کے بعد فاطمہؑ کا عالم یہ ہوا کہ ایک کنیز دوڑی آئی۔ کہا اے بلال! اذان ختم کرو۔ فاطمہؑ زہراء کی جیسے روح جسم سے مفارقت کر گئی ہے۔ اس طرح یہ اذان شروع ہوئی مگر ختم نہ ہو سکی۔

بس جناب! انشاء اللہ آپ نے گریہ کا اس وقت جو حق تھا وہ ادا کر دیا حالانکہ عام زبان میں تو کوئی مصائب بیان بھی نہیں ہوئے۔ مگر اب فاطمہؑ زہراء سے بس اتنا کہوں گا کہ شاہزادی! آپ نے بڑی عزت کے ساتھ اپنے باپ کا نام سنا تو آپ کا عالم یہ ہوا۔ سکینہؑ کے دل کی خبر لیجئے۔

آگے خروش گریہ کی وجہ سے ٹیپ ریکارڈ میں کوئی لفظ نہیں آ سکی۔ گریہ، گریہ، گریہ اور مسلسل گریہ۔

۳۰ الف

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن نمبر ۱۳۶

امامت

از افادات

حضرت سید العلماء مدظلہ

قیمت ۲ر

محصول ار